حبیب محمد حبیب کی مرثیہ نگاری

ELEGY WRITING OF HABIB MUHAMMAD HABIB

[1] منیر احمد ملک [2] ڈاکٹر طاہر عباس

Abstract:

This article contains the definition of Marsiya (ELEGY) , shows difference between traditional Marsiya (ELEGY) and modern Urdu Marsiya (ELEGY) and tradition of Marsiya Nigari in Bahawalpur.

History of Marsiya (ELEGY) writing in Bahawalpur shows leading elegists such as Agha Sikandar Mehdi, Nafees Fatehpuri, Gulzar Nadim Sabri, Masood Hassan Shahab etc. Habib Muhammad Habib is one of those renowned elegists who excelled and perfected the art of elegy/Marsiya writing in Bahawalpur. He is the leading exponent of modern Marsiya nigari in Bahawalpur. He composed as easily as he spoke, observing all contents of Marsiya. Among his contemporary elegists, his individuality is the obvious truth.

Keywords: **Habib Muhammad Habib, Elegy, History of Elegy, Bahawalpur, Agha Sikandar Mehdi, Nafees Fatehpuri, Gulzar Nadim Sabri.**

یہ آرٹیکل مرثیہ کی تعریف ،روایتی مرثیہ اور جدید اردو مرثیہ میں فرق اور بہاول پور میں مرثیہ نگاری کی روایت پر مشتمل ہے ۔بہاول پور میں مرثیہ نگاری کی تاریخ میں آغا سکندر مہدی ، نفیس فتح پوری ، گلزار نادم صابری اور مسعود حسن شہاب جیسے نمایاں مرثیہ نگار شامل ہیں ۔ان معروف مرثیہ نگاروں میں سے حبیب محمد حبیب ایسے مرثیہ نگار ہیں جنھوں نے بہاول پور میں مرثیہ نگاری کے فن کو عروج دیا اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا ۔ بہاول پور کی جدید مرثیہ نگاری میں وہ نمایاں مقام رکھتے ہیں ۔مرثیہ نگاری کے تمام اجزاء کو سامنے رکھتے ہوئے اُنھوں نے عام فہم زبان میں مرثیے مرتب کیے۔ اپنے ہم عصر مرثیہ نگاروں میں ان کی انفرادیت ایک واضح حقیقت ہے ۔

کلیدی الفاظ: مرثیہ، اُردو مرثیہ، بہاول پور، روایت، آغا سکندر مہدی، نفیس فتح پوری، گلزار نادم صابری، مسعود حسن شہاب دہلوی، حبیب محمد حبیب، مرثیہ گو، مرثیہ نگار

مرثیہ اردو شاعری کی وہ صنف سخن ہے جس میں غزل کی سادگی اور سوز و گداز، قصیدے کی شان و شوکت، مثنوی کا انداز بیاں، رزم و بزم کی مرقع کشی، فطرت نگاری، انسانی رشتوں اور تعلقات کی ترجمانی اور حق و باطل کی جنگ سبھی کچھ موجود ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ ایک اعلیٰ پائے کا مرثیہ تمام اصناف سخن کی خصوصیات کا مجموعہ ہوتا ہے تو غلط نہیں ہو گا۔ لفظ ''مرثیہ'' کا مفہوم مختلف ممالک اور مختلف زبانوں میں مختلف رہا ہے۔ اگر ہم عربی، فارسی، اُردو اور انگریزی زبانوں میں لفظ مرثیہ، رثا، نوحہ وغیرہ کی تاریخ دیکھیں تو ہمیں لفظ مرثیہ کے متعلق مختلف باتیں ملیں گی۔

---

[1] اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ گریجوایٹ کالج، خان پور، رحیم یار خان

[2] اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، دی اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور

مرثیہ اردو کی ایک زندہ اور متحرک صنف سخن ہے۔ قدیم دکنی مرثیے سے لے کر جدید مرثیے تک اس شعری تجربے نے کئی کروٹیں بدلی ہیں۔ مرثیہ اردو کی ایک ایسی صنف سخن ہے جسے اردو کی اپنی ایجاد کہا جا سکتا ہے۔

مرثیہ عربی زبان کے لفظ ''رثا'' سے مشتق ہے جس کے معنی مرنے والے کی وفات پر دکھ کا اظہار کرنا ہے۔ گویا مرثیہ ایسی صنف شعر ہے جس میں کسی مرنے والے کا ذکر اور اس کی تعریف رنج والم کے پیرائے میں کی جاتی ہے۔ مرثیہ کے معنی کسی کی موت پر جی کڑھانا اور اس کے مصائب و محاسن بیان کر کے اس کا نام دنیا میں زندہ کرنا ہے۔ بقول مولانا الطاف حسین حالی:

> ''مرثیہ کا اطلاق ہمارے ہاں زیادہ تر شہدائے کربلا اور خاص کر جناب سید الشہداء کے مرنے پر ہوتا ہے۔''[۱]

زین العابدین شعر و ادب میں لکھتے ہیں:

> ''رثا'' ان اشعار کو کہتے ہیں جن میں مرنے والوں کا ماتم کیا جائے۔ دوستوں اور اقارب کی تعریف کا ذکر ہو۔ قوم کے قائدین، فرماں رواؤں کے مرنے پر الم کا اظہار ہو، اور آئمہ اطہارؓ خاص طور پر حضرت سید الشہداء کے مصائب کا ذکر ہو۔ ان کے مناقب و فضائل بیان کیے جائیں۔''[۲]

زین العابدین آگے چل کر مرثیے کی تین بنیادی سمتیں متعین کرتے ہیں:۔

۱۔ رثائے شریفائی و رسمی

۲۔ رثائے شخصی و خانوادگی

۳۔ رثائے مذہبی

۱۔ رثائے شریفائی و رسمی:

یہ وہ مرثیے ہیں جن میں اکابرین قوم اور سلاطین کی موت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ فرخیؔ کا مشہور مرثیہ جو محمود غزنوی کی موت پر لکھا گیا ہے اور جس کی ہئیت قصیدے کی ہئیت ہے، اس کی مثال ہے۔

۲۔رثائے شخصی و خانوادگی:

ان مرثیوں میں شعرا اپنے دوستوں، اپنے خاندان والوں یا اپنے پیاروں کے مرنے پر اظہار تاسف اور تلقین صبر کرتے ہیں۔

۳۔رثائے مذہبی:

یہ وہ مرثیے ہیں جن میں پیشوایانِ دین کی موت موضوع سخن بنتی ہے۔ خاص طور پر آئمہ اطہارؓ، سید الشہداءؓ کربلا کی وفات کا ذکر ان مرثیوں کا موضوع ہوتا ہے۔ سید عابد علی عابد اصول انتقاد ادبیات میں لکھتے ہیں:

> ''ادبی اصطلاح کے طور پر مرثیہ اس صنف شعر کو کہتے ہیں جس میں سید الشہداءؓ حضرت امام حسینؓ یا ان کے رفیقوں کے سفر کربلا، مصائب، شجاعت اور شہادت کا بیان کیا جائے اس ضمن میں کئی اور چیزیں بھی آجاتی ہیں لیکن اصلاً اردو مرثیے کی بنیاد انہیں باتوں پر قائم ہے۔''[۳]

مرثیے کے اجزاء موضوعی ساخت کے اعتبار سے حسب ذیل ہیں:

چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، شہادت، ماتم، بین، دعا۔

مرثیہ گوئی کے ارتقاء کے بارے میں عبدالسلام ندوی نے ''شعر الہند'' میں لکھا ہے:

> ''اردو ادب کی اکثر اصناف کی طرح مرثیہ گوئی کا آغاز بھی دکن میں ہوا۔''[۴]

حامد حسن قادری لکھتے ہیں:

> ''محمد قلی قطب شاہ غالباً سب سے پہلا مرثیہ گو بھی ہے۔ اس کی غزلیات، قصائد و مثنویات میں مرثیے بھی شامل ہیں۔ اس کی تقلید میں شعرائے بیجاپور نے بھی شاہان بیجاپور ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰ء۔۱۶۲۹ء) اور محمد عادل (۱۶۵۶ء۔۱۶۷۳ء) کے زمانے میں مرثیے لکھے۔''[۵]

غرض دکنی شعرا نے حزنیہ ادب اس کثرت سے پیش کیا اور اس میں اتنے پر تاثیر ادب پارے تیار کیے کہ ان کے مرثیے دکن میں مقبول ہونے کے علاوہ شمالی ہند تک پہنچ گئے۔ دربار بیجاپور کا ایک شاعر نوریؔ جس کا زمانہ سترہویں صدی عیسوی کا ربع اول ہے جو اکبر و جہانگیر کا معاصر ہے۔ اس نے مرثیے کی ہئیت مثنوی کی سی رکھی۔ نوریؔ کے اکثر مرثیے مثنوی کی چھوٹی بحروں میں ہیں۔ محمد قلی قطب نے اپنی تصانیف میں طویل تر بحریں اختیار کیں۔ جن کا انداز ''سلام کا سا ہے''۔

نصیر الدین ہاشمی کے بقول:

''اردو کا سب سے قدیم مرثیہ گو ملا وجہی ہے۔ اس کے یہ اشعار بطور نمونہ ملتے ہیں:۔

حسینؓ کا غم کرو عزیزاں
انجوں نین سوں جھڑو عزیزاں
بنا جو اول ہوا ہے غم کا
عرش لگن رو ہر سمت ہلایا
یوں کیا اندیشہ کیتا
فلک شہاں پر ستم خدایا
تمھارے وجہی، کوں یا اماماں
نہیں تمن بن یواس کوں سایا[۶]

قدیم اور جدید اردو مرثیہ کا فرق:

''سب سے بڑی چیز جو جدید مرثیوں کو قدیم مرثیوں سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ آزادی فکر کی روح ہے۔''[۷]

اس آزادی فکر میں ملک و ملت اور فرد کی آزاد خیالی شامل ہے، اب انسانی آواز پر خدائی آواز کا دھوکا ہونے لگا ہے۔ یہی سبب ہے کہ مرثیہ نگاروں کے یہاں نہ تشبیہات کا وہ جال ہے جیسے قدیم مرثیہ نگاروں نے بچھا رکھا تھا نہ اشعار کی وہ کمندیں ہیں جنہیں قدیم شعرا نے سامعین کے ذہنوں کو شکار کرنے کے لیے پھینک رکھی تھی۔ اسی طرح محاورات اور صنعتوں کا جا بجا استعمال بھی موجودہ مرثیہ نگاروں کے یہاں مذموم سمجھا

جانے لگا ہے۔ آج کا مرثیہ جدید حریت اور شان خداوندی کا ایک حسین مرقع ہے۔ جدید دور کے مرثیوں کی دوسری خوبی براہ راست طرز تخاطب ہے۔ قدیم مرثیوں میں شاعر واقعات کی رو کو اپنے کرداروں کے ذریعے بڑھاتا ہے اور خود سامنے نہیں آتا، لیکن دورِ جدید کا شاعر اپنے سامعین سے خود مخاطب ہے۔ اس دور میں خود شاعر کے ہاتھوں میں واقعات و حالات کی نبض ہے۔ اسے کسی کردار کے سہارے کی ضرورت نہیں۔ اب وہ تمام حالات و واقعات کا جائزہ لیتا ہے اور اپنے ذہنی تصورات کو وہ اپنے تک خود پہنچاتا ہے۔ صرف ذات حسینؓ شاعر اور سامعین کے درمیان حائل ہے وگرنہ جہاں تک عقائد اور تصورات کا تعلق ہے شاعر اپنے سامعین سے خود گفتگو کرتا ہے۔

اسلام دینِ عظمتِ انسان ہے دوستو

قدیم مرثیوں میں اکثر مطلع اس ڈھب کے ملتے ہیں لیکن ان کا انداز چند ہی مصرعوں کے بعد بدل جاتا ہے۔ مثلاً قدیم اور جدید مرثیوں میں وہی فرق ہے جو مکالمے اور تبصرے میں ہے۔ قدیم مرثیہ نگار مکالماتی انداز کے تحت ہم سے ہم کلام ہوتے تھے لیکن جدید دور کا شاعر مکالمے سے بالکل کام نہیں لیتا۔ موضوع کے اعتبار سے بھی جدید مرثیہ قدیم مرثیوں سے جدا دکھائی دیتا ہے۔ اب جدید مرثیوں میں نہ صبح کا سماں ہے نہ شام کا انداز، نہ گرمی کی شدت کا تذکرہ ہے نہ لو کا بیان ملتا ہے۔ قدیم دور کا شاعر جزئیات اور تشریحات سے کام لیتا تھا۔ دور جدید کا شاعر اب اشاروں اور کنایوں میں گفتگو کر رہا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جدید مرثیہ اپنے موضوع کے اعتبار سے نہ صرف فلسفیانہ ہے بلکہ اپنے دامن میں آفاقیت کا انداز بھی رکھتا ہے۔ اگر پہلے مصرعے میں کائنات کا ایک منظر ہے تو دوسرے میں کل کائنات۔ ہمارا قدیم مرثیہ نگار جب کسی نظر یا واقعہ کا بیان کرتا ہے تو اس منظر کی عظمت میں اپنے ہیرو کی عظمت سے چار چاند لگاتا ہے یعنی صبح اس لیے حسین و جمیل ہے کہ حسینؓ اور ان کے اصحاب کے حسین چہروں سے نور برس رہا ہے۔ جدید مرثیہ گو اس سہارے کے قائل نہیں ہیں۔ اب وہ فکری انداز میں ناقدانہ طرز پر پیچیدہ مسائل کی گتھیاں سلجھاتے ہیں۔ قدیم مرثیہ نگاروں کے یہاں حسینؓ کا دل، ان کے دماغ سے زیادہ اپیل کرتا

ہے۔اب حسینؓ کا دماغ ان کے دل پر فوقیت رکھتا ہے۔آج کا مرثیہ نگار حسینؓ کی فکری اور ذہنی برتری کو اقوام عالم کے سامنے پیش کر کے چند نتائج نکالنا چاہتا ہے۔

قدیم وجدید مرثیہ گوئی میں ایک بنیادی فرق مقصد کے تعین کا ہے۔قدیم مرثیوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مرثیے فقط رونے رُلانے کے لیے لکھے گئے۔جدید مرثیہ نگاروں کے یہاں مجاہد کا سا انداز کار فرما ہے۔قدیم دور میں رونے والا رو کر سنیاسی بنتا ہے جدید دور میں رونے والا سپاہی بنتا ہے۔قدیم مرثیوں میں حسینؓ کو انسان نہیں بلکہ امام کے طور پر پیش کیا گیا۔اس کی غالباً وجہ یہ تھی کہ امام کی تعظیم انسان کی تعظیم کے مقابلے میں زیادہ ہے۔جدید دور میں حسینؓ بحیثیت انسان کامل پیش کیے گئے ہیں۔

جدید مرثیے میں کئی امتیازات ایسے ہیں جو اسے نئی اور ترقی پسند شاعری کی صنف میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ایک امتیاز ان میں سے یہ ہے کہ نئے مرثیے کا چہرہ، جدید احساسات کی آماجگاہ بن گیا۔مرثیے اب پہلے جیسے کہانیہ یا بیانیہ مرثیے نہیں رہے بلکہ تحلیل نفسی کا موثر عمل بن گئے ہیں۔

اردو مرثیے کی روایت تو مرزا سودا اور میر ضمیر کی دین سمجھی جاتی ہے مگر اسے عروج لکھنؤ کی اثنا عشری تہذیب میں ملا۔کون نہیں جانتا کہ میر انیس اور مرزا دبیر نے مرثیے کی زمین کو آسمان بنایا اور ایک وقت میں مرثیے کی صنف اردو غزل اور مثنوی کے ہم پلہ ٹھہری۔بعد ازاں یہی روایت برصغیر پاک وہند کے دوسرے چھوٹے بڑے شہروں تک پھیل گئی اور یہاں کی بعض ریاستوں میں تو اس کے لیے خصوصی اہتمام، سہولت اور گنجائش بھی پیدا کی گئیں۔

ریاست بہاول پور بھی اسی خطے کی ایک بڑی ریاست ہے۔اس ریاست میں جہاں دانش وحکمت اور علم وادب کی دیرینہ روایات موجود ہیں۔وہاں اردو شاعری کی مختلف اصناف پر بھی بہت کام ہوا ہے۔تقسیم ہند اور اس کے بعد بہاول پور میں اردو مرثیہ کو نا صرف موافق ماحول ملا بلکہ یہاں اردو مرثیے کے فروغ کے لیے باقاعدہ انجمنیں بھی دکھائی دیتی ہیں اور اس سلسلے میں کئی نامور شخصیات پیش پیش دکھائی دیتی ہیں۔ان میں ایک نام حبیب محمد حبیب کا ہے۔

''حبیب محمد حبیب۱۹۳۸ء کو راج ناتھ گاؤں مدھیا پردیش سورت ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم کراچی میں حاصل کی۔ حبیب بنک کے تحت کام کرنے والے اداروں، حبیب انجینئرز، حبیب مرکنائل وغیرہ، ملتان و بہاول پور ریجن کے ڈائریکٹر تھے۔ خاندانی پیشہ تجارت ہے۔ ۱۳ مئی ۱۹۸۰ء ملتان میں وفات پائی۔ ''حیدری کلب'' بہاول پور کے معاون رکن تھے''۔[۸]

حبیب محمد حبیب کی زبان گجراتی تھی،ان کے آباءواجداد کا تعلق قدیم کاٹھیاواڑ گجرات ہند سے تھا مگر جب وہ ریاست بہاول پور آئے تو اردو خواں بن گئے۔ان کی نظم ''بوڑھا ساگر'' معرکے کی نظم ہے۔تاہم بعد میں حبیب محمد حبیب نے اپنے آپ کو صرف مرثیہ گوئی تک محدود کر لیااور انہوں نے مرثیے کے علاوہ بڑے عمدہ سلام اور منقبت بھی لکھے وہ مختصر مرثیت کی تحریک کے زبردست حامی تھے۔ان کا پہلا مرثیہ بہ عنوان ''بیت سعادت''، مختصر مرثیے کی ایک اچھی مثال ہے۔

اردو شاعری کے ارتقائی سفر میں مرثیہ، نظم جدید کے ہم پلہ ہے۔ عصر حاضر کے تنقیدی اصولوں نے شاعری کے لیے جو محاسن مقرر کیے ہیں مرثیہ ان کی مکمل تائید کرتا ہے۔جدید دور کا مرثیہ قدیم مرثیے سے اس درجے مختلف ہے کہ اس میں چہرے، بکااور بین کے خاتمے کا ترکیبی عنصر موجود نہ ہوتا تو کوئی اور صنف سخن بن جاتا۔ کربلا کے حسینیؓ کرداروں میں عباسؓ ابن علیؓ کی پروقار شخصیت، ذہن انسانی کی تربیت کا ایک بہت بڑا ذریعہ کہلاتی ہے۔ہر عہد کے مرثیہ نگاروں نے اس کردار کی خوبیوں کا تجزیہ کیا ہے اور اس تجزیے سے انسانی تمدن کو شائستگی، شرافت اور انسان کی عظیم ترین خصلتوں کے سبق پڑھائے ہیں۔ گزشتہ نصف صدی میں حضرت عباسؓ ابن علیؓ کے حوالے سے کئی مرثیے لکھے گئے۔ حبیب محمد حبیب نے بھی یہی موضوع تلاش کیا۔ اس موضوع کو انہوں نے جو خارجی نام دیا وہ بھی بالکل اچھوتا ہے۔ وگرنہ اب تک اس موضوع کے اکثر مرثیوں کے نام میں وفا کا لفظ جزولازم کی حیثیت رکھتا تھا۔

''حُر ذی جاہ''اور ''بیت سعادت'' کے لفظوں میں جو خوشگوار جذبے موجزن ہیں۔ان کا اندازہ یا تو خود شاعر لگا سکتا ہے یا وہ اچھا قاری جو شعر کو پوری طرح محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور جو ان تخیلات کو یکجا کر سکے جو شاعر کے تخلیقی عمل کا سرمایہ تھے:

''بیت سعادت'' ایک مختصر مرثیہ ہے۔ ''جہاں تک میری علمی رسائی ہے میں بڑے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اردو کے شائع شدہ مرثیوں میں اتنا جامع اور مختصر مرثیہ اب تک سامنے نہیں آیا۔ انتالیس بند اردو مرثیے کی تشکیل میں ایک کامیاب تجربہ ہیں۔ کوئی عنصر کہیں بھی کمزور نہیں۔ چہرہ ویسا ہی تر و تازہ ہے جیسا دو سو بند کے مرثیوں کا ہو۔ رجز اور معرکے کے مضامین اسی نسبت سے ہیں جو اس طرح کے مختصر مرثیے میں ممکن ہو سکتے ہیں۔''[۹]

مرثیے کا روایتی قاری مرثیے میں بین کے حصے کی اثر انگیزی کا متقاضی ہوتا ہے۔ ایسے قاری کو تسکین کا سامان بھی اس مرثیے میں بہم پہنچایا گیا ہے اور غیر معقول اور غیر منطقی اظہار سے رونے رلانے کا سامان پیدا نہیں کیا گیا۔ حالات اور واقعات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ بین کے مناظر میں سخت سے سخت آنکھ بھی پر نم ہو جاتی ہے۔ فنی طور پر مرثیے کا مطالعہ کرنے والے بھی اس اثر انگیز اظہار پر مختصر ہونے کے باوجود نقص ترکیب کا الزام نہیں لگا سکتے۔ مرثیے اور مسدس میں جو باریک سا فرق ہے۔ ''بیت سعادت'' کا شاعر اس فرق کو بخوبی جانتا ہے وگرنہ میدان شاعری کے بڑے بڑے امام اس معرکے میں چت نظر آتے ہیں۔ مرثیہ ایک مشکل ترین صنف سخن ہے۔ اس صنف میں کمال حاصل کرنا تو درکنار، کوئی شاعر اعلیٰ درجے کی تربیت کے بغیر اس میں شعر بھی نہیں کہہ سکتا۔ مرثیے لکھنے کے لیے ایک شاعر میں جن خواص کا ہونا ضروری ہے وہ یہ ہیں:۔

۱۔ واقعہ کربلا کی تاریخ سے مکمل آگہی ہو۔

۲۔ علم النّفس، تجزیے اور اظہار پر قادر ہو۔

۳۔ اردو شاعری بالخصوص غزل کا وسیع مطالعہ ہو۔

۴۔ برصغیر پاک و ہند کی تہذیبی فضا کو جانتا ہو۔

۵۔ علم بیان اور علوم عصر سے مکمل واقفیت رکھتا ہو۔[۱۰]

''حُر ذی جاہ'' اور ''بیت سعادت'' کا شاعر اظہار اور شعور کے اعتبار سے ان تمام خصوصیات کا شاعر معلوم ہوتا ہے تاہم اس مرثیے میں کہیں کہیں شاعر کا تخلیقی عمل کمزور بھی معلوم ہوتا ہے۔ مصرعے سیدھے سادے ہیں۔ مصرعوں کا سیدھا سادہ ہونا مرثیے میں ایک بڑا نقص سمجھا جاتا ہے۔ ان میں بیان کی کوئی ندرت

ہونی چاہیے۔اظہار کا اچھوتا پن اور لہجے کی انفرادیت ضروری ہے۔ مرثیے میں مجموعی تاثر سے زیادہ مصرعوں کی اپنی منفرد اکائیوں کو دیکھنا پڑتا ہے۔ بند کے چار مصرعوں کا ہر مصرع اپنی ایک معنوی وحدت لیے ہوتا ہے لیکن بڑے سے بڑا شاعر بھی پورے طور پر ان تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ اگر حبیب محمد حبیب کے اس مرثیے (بیت سعادت) میں بعض مقامات کم جاذب نظر دکھائی دیتے ہیں تو یہ غیر متوقع صورتحال ہر گز نہیں۔

حبیب محمد حبیب مرثیے سے پہلے غزل کے شاعر تھے۔ یہ صنفی وفاداریاں تبدیل کیے ہوئے انہیں زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ انہوں نے ''بیت سعادت'' لکھا۔

بقول ڈاکٹر اسد اریب:

> ''۔۔۔جب وہ غزل کے مشاعروں میں شرکت کرتے اور آزمائشی طرحوں پر طرح لگاتے تھے۔ میرے دیکھتے دیکھتے ان کی طبیعت میں یہ انقلاب آیا۔ میں بھی نہیں کہہ سکتا کہ مرثیے کی فضا میں یک لخت داخل ہوئے۔ غزل کے مشاعروں سے کنارہ کشی کر لی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے غزل اور مرثیے کا عبوری وقفہ سلام کہنے میں صرف کیا۔ اور اب ان کے پاس سلامیہ شاعری کا ایک قابل قدر تخلیقی سرمایہ موجود ہے۔''[۱۱]

حبیب محمد حبیب نے اپنے کردار عباسؓ ابن علیؓ پر جو مرثیہ لکھا ہے اس میں وہ کردار کی زبانی الفاظ ادا نہیں کراتے بلکہ اس مرثیہ میں خود شاعر اس کردار کا تعارف اور اتمام حجت کرتا ہے۔ حالاں کہ آغا سکندر مہدی، نفیس فتح پوری اور شہاب دہلوی کے ہاں ایسا نہیں۔ یہ منفرد انداز صرف حبیب محمد حبیب کے مرثیہ ''بیت سعادت'' میں ملتا ہے۔ ایک بند ملاحظہ فرمائیے:

مقصود ہے مجھے اسی کردار کا بیاں
نور نگاہ حیدرؓ کردار کا بیاں
عباسؓ باوفا کا علمدار کا بیاں
حق آشنا کا حق کے طرفدار کا بیاں
ممتاز و منفرد جو وفاداریوں میں ہے
ثابت قدم، جو حق کی طلبگاریوں میں ہے[۱۲]

حبیب محمد حبیب کے مرثیے ''بیت سعادت''اور ''حُر ذی جاہ''میں بہت سے بند ایسے ہیں جن میں مدحت اہل بیت کی گئی ہے۔ یہ مرثیے کا چہرہ ہے۔ مختلف شعرا نے اپنے مرثیوں کا چہرہ مختلف رکھا۔آغا سکندر مہدی، نفیس فتح پوری اور شہاب دہلوی نے اپنے مرثیے کا چہرہ حمد و نعت سے شروع کیا تھا۔ مگر حبیب محمد حبیب کے ہاں یہ صورت ذرا مختلف ہے۔ دو بند ملاحظہ فرمایئے:

مشہور ہے زمانے میں ذکر ان کا عام ہے
اہل نظر میں ان کا بڑا احترام ہے
منصب بلند ان کا ہے، عالی مقام ہے
ان کے محب پر آتش دوزخ حرام ہے
یہ جانثار دین نبیؐ ہیں، شہید ہیں
یہ بارگاہ رب علیٰ میں سعید ہیں[۱۳]
یہ جانئے کہ ہے اس زیست کا تقاضا کیا
رہے نظر میں کہ انجام کار کیا ہو گا
حیات روزہ دو روزہ کا ہے بھروسا کیا
یہ فکر بھی ہو کہ پیش آئے روز فردا کیا
ہر ایک بات کا اپنی جواب دینا ہے
بہ پیش داور محشر حساب دینا ہے[۱۴]

حبیب محمد حبیب کے ہاں سراپا عباسؓ ابن علیؓ ملاحظہ فرمایئے:

عباسؓ ہے کتاب وفا کا سر ورق
یاد آ رہا ہے اس سے وفا کا سبق سبق
جلوہ فگن ہے ذہن کے مطلع پہ وہ شفق
جس سے مرے شعور کا روشن ہے ہر طبق
خدمت گزارِ خاص، یہ حق کے ولی کا ہے
ام البنیں کا لال ہے بیٹا علیؓ کا ہے[۱۵]

ہے پیکر خلوص و وفا، شہ کا جانثار
اس کے عمل عمل سے مودت ہے آشکار
شہ کا رفیق شہ کا محب، شہ کا دوست دار
چھوٹوں کا حق شناس، بڑوں کا ادب گزار
اک اک ادا میں اس کی قرینہ علیؓ کا ہے
لنگر ہے اس کے ہاتھ سفینہ علیؓ کا ہے[۱۶]

حضرت عباسؓ ابن علیؓ کی شجاعت اور بہادری ملاحظہ فرمایئے:

عزم و ثبات ان پہ فدا ہے قدم قدم
سرکی ہے اس نے، منزل عشق شہ امم
اب تک ہے دل میں ہیبت عباسؓ ذی چشم
ڈرتے ہیں ان کے نام سے کل باغیٔ ستم
عالم میں یہ علیؓ ولی کی نظیر ہے
تیغ اس کی یادگارِ جنابِ امیر ہے[۱۷]

حضرت حُر کی شجاعت ملاحظہ ہو:

نہ تیغ کی اسے پروا، نہ تیر کی پروا
نہ اقتدار، نہ فوج کثیر کی پروا
گروہ شام، نہ اس کے امیر کی پروا
تھی حُر کو صرف صدائے ضمیر کی پروا
یہ پہلا وار تھا مظلوم کی حمایت کا
طمانچہ تھا رخ ظالم پہ حق کی طاقت کا[۱۸]

حضرت عباسؓ کی آمد میدان کارزار میں ملاحظہ فرمایئے:

ہمت بھی اس جری میں علیؓ کی مثال ہے
جرات ہے، دبدبہ ہے شجاعانہ چال ہے

روکے جری کو کون، یہ کس کی مجال ہے
پیاسی جو کربلا میں محمدؐ کی آل ہے
وہ آ رہا ہے مشک سکینہ لیے ہوئے
کاندھے پہ زندگی کا خزینہ لیے ہوئے[۱۹]

حضرت حُر کی آمد ملاحظہ ہو:

چلا جو تیغ کو تولے ہوئے حر ذی جاہ
غلام اور برادر یہ سب ہوئے ہمراہ
اسے یہ شوق کہ آئے کوئی ملائے نگاہ
انھیں یہ فکر کہ ڈھونڈیں کوئی فرار کی راہ
کوئی جواب رجز میں بھی لب ہلا نہ سکا
مقابلہ پہ جو آیا وہ بچ کے جا نہ سکا[۲۰]

''بیت سعادت'' میں میدان جنگ کا نقشہ کیا خوب کھینچا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

میدان جنگ گرم تھا قرنا کا تھا خروش
بجتا تھا ساز جنگ تو بڑھتا تھا اور جوش
باقی حواس تھے نہ بجا تھے کسی کے ہوش
تن بھی گراں تھے جان پہ، سر بھی وبال دوش
تیروں کا مینھ برستا تھا نیزوں کی باڑ میں
تلواریں منھ چھپاتی تھیں ڈھالوں کی آڑ میں[۲۱]

تلوار کی تعریف میں حبیب محمد حبیب یوں رقم طراز ہیں:

خیبر کشا کے لال کی تلوار یوں چلی
جس پر پڑی، بغیر لیے دم نہیں ٹلی
افواج بد نہاد میں برپا تھی کھلبلی
وہ معرکہ تھا گرم کہ یاد آ گئے علیؓ

اس شعلہ خو کی چال میں، تیزی بلا کی تھی
دم خم بھی تھا، نیاز بھی تھا، اور ادا بھی تھی[۲۲]

حبیب کے ہاں جزئیات نگاری بھی ملتی ہے۔ باریک سے باریک واقعہ بھی ان کے مرثیہ سے اوجھل نہیں ہوا۔ منظر کشی کا بہترین نمونہ ملاحظہ فرمایئے:

دریا پہ باوفا کے جو بازو ہوئے قلم
برسا رہے تھے تیر ادھر بانی ستم
دانتوں میں اس کے مشک تھی، کاندھے پہ تھا علم
دونوں ہی دم کے ساتھ تھے، جب تک تھا دم میں دم
اعدا کے ظلم و جور سے، گو نیم جان تھا
لیکن جری کو بی بی سکینہؓ کا دھیان تھا[۲۳]

حضرت حر کی میدانِ کارزار کے لیے رخصت ملاحظہ ہو:

حسین حر کی محبت میں ہم رکاب چلے
جلو میں اکبر و قاسم پئے ثواب چلے
عقب میں شہ کے دلاور بہ آب و تاب چلے
کہ جیسے حلقہ انجم میں ماہ تاب چلے
خیام سے حرم شاہ نے دعائیں دیں
جناب حر کی بہت دور سے بلائیں لیں[۲۴]

شہادت حضرت عباسؓ ملاحظہ فرمایئے:

عباسؓ کے قریب جو پہنچا نبی کا لال
دیکھا کہ شیر، خون کے بہنے سے ہے نڈھال
نزدیک شام، مہر ہو جیسے دم زوال
رنگت ہے زرد چاند سے چہرے پہ ہے ملال

حسرت برس رہی ہے، تن چاک چاک پر
بیٹا ابو تراب کا، لیٹا ہے خاک پر[۲۵]

حضرت حُر کی شہادت ملاحظہ فرمایئے:

بس اے حبیب نہیں تاب ضبط آہ فغاں
ہر ایک فرد ہے فرش عزا پہ نوحہ کناں
شریکِ بزم عزا ہیں یہاں قسیمِ جناں
جناب فاطمہ زہرا بھی ہیں بہت گریاں
ہمیشہ تذکرہ حق میں انہاک رہے
سروں پہ سایہ دامان آل پاک رہے[۲۶]

حبیب کے ہاں ماتم ملاحظہ فرمایئے:

سبط رسولؐ بیٹھ گئے تھام کے کمر
سب سے سوا تھا زوجہ عباسؓ پر اثر
وہ غم نصیب کانپ رہی تھی جھکا کے سر
زینبؓ دہائی دیتی تھی سر پیٹ پیٹ کر
نانا، ہمارے ساتھ یہ امت نے کیا کیا
تیغ ستم سے اجر رسالت ادا کیا[۲۷]

مرثیے کے آخر میں شاعر مرثیے کے حوالے سے اپنے قلم عزیز کے لیے دعائیہ بند لکھتا ہے۔ اس مرثیے میں بھی ایک بند دعائیہ ہے:

حد ادب، یہ وقت دعا ہے، دعا کروں
توفیق ہو کہ مجلس و ماتم بپا کروں
ہر سال، لکھ کے مرثیہ تازہ پڑھا کروں
میں بھی حبیب و حق مودت ادا کروں

مولا! مجھے جو آپ کی حاصل مدد رہے
زندہ رہوں، کلام مرا، تا ابد رہے[۲۸]

المختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حبیب محمد حبیب کے مرثیے نہ صرف معیاری مرثیے کے معیار پر پورا اترتے ہیں بلکہ جدید مرثیے کی تعریف پر بھی پورا اترتے ہیں۔ حبیب محمد حبیب کے ہاں مرثیوں میں جدید اردو مرثیے کی تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ بہاول پور (سابق ریاست بہاول پور) کا شمار پاکستان کی بہت بڑی ریاست میں ہوتا ہے جس کو قدرت نے ہر حوالے سے خوشحال کیا ہے۔ ادبی حوالے سے بھی یہ ریاست اپنی جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ خاص طور پر مرثیہ نگاری کی صنف میں بڑے سے بڑے تہذیبی و ادبی مراکز سے کسی طور بھی کم نہیں ہے۔ بہاول پور جہاں آغا سکندر مہدی، نفیس فتح پوری، گلزار نادم صابری اور مسعود حسن شہاب جیسے قدآور شاعر اور مرثیہ نگار موجود تھے وہاں رہتے ہوئے حبیب محمد حبیب نے نہ صرف مرثیے کی جاندار اور شاندار روایت کو جاری رکھا بلکہ اپنے مراثی میں جدت اور ان میں بھی بہترین جدید معیاری مرثیے لکھ کر اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا۔

حوالہ جات

۱۔ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری (لاہور: کشمیر کتاب گھر، ۱۹۹۹ء)، ص ۱۶۴۔

۲۔ زین العابدین، شعر و ادب فارسی (تابش تہران: لالہ زار، سن ندارد)، ص ۴۷۔

۳۔ سید عابد علی عابد، اصول انتقاد ادبیات (لاہور: مجلس ترقی ادب، اشاعت دوم، ۱۹۶۶ء)، ص ۵۵۔

۴۔ عبدالسلام ندوی، شعر الہند (جلد دوم) (اعظم گڑھ: معارف پریس، ۱۹۵۴ء)، ص ۱۲۸۔

۵۔ حامد حسن قادری، مختصر تاریخ مرثیہ گوئی (مطبوعہ ندارد، ۱۹۶۹ء)، ص ۱۷۔

۶۔ ڈاکٹر اسد اریب، اردو مرثیے کی سرگزشت (لاہور: شرکت پرنٹنگ پریس، ۱۹۸۹ء)، ص ۸۔

۷۔ راقم الحروف کا استفسار از ڈاکٹر اسد اریب، گل گشت کالونی ملتان، ۲ فروری ۲۰۲۱ء۔

۸۔ ڈاکٹر اسد اریب، اردو مرثیے کی سرگزشت، ص ۱۳۱۔

۹۔ ڈاکٹر اسد اریب، ''ابتدائیہ''، مشمولہ: بیتِ سعادت، حبیب محمد حبیب (ملتان: مشابہ آرٹ پریس،۱۹۹۹ء)، صفحہ ندارد۔

۱۰۔ ایضاً۔

۱۱۔ ایضاً۔

۱۲۔ حبیب محمد حبیب، بیتِ سعادت(ملتان:مشابہ آرٹ پریس،۱۹۹۹ء)،ص۹۔

۱۳۔ ایضاً،ص۶۔

۱۴۔ حبیب محمد حبیب،حُر ذی جا(ملتان:مشابہ آرٹ پریس،۱۹۹۷ء)،ص۸۔

۱۵۔ حبیب محمد حبیب،بیتِ سعادت،ص۱۰۔

۱۶۔ ایضاً،ص۱۲۔

۱۷۔ ایضاً،ص۱۵۔

۱۸۔ حبیب محمد حبیب،حُر ذی جا،ص۲۶۔

۱۹۔ حبیب محمد حبیب،بیتِ سعادت،ص۱۷۔

۲۰۔ حبیب محمد حبیب،حُر ذی جا،ص۲۵۔

۲۱۔ حبیب محمد حبیب، بیتِ سعادت،ص۲۵۔

۲۲۔ ایضاً،ص۲۲۔

۲۳۔ ایضاً،ص۳۲۔

۲۴۔ حبیب محمد حبیب، حُر ذی جا،ص۳۰۔

۲۵۔ حبیب محمد حبیب،بیتِ سعادت،ص۳۶۔

۲۶۔ حبیب محمد حبیب،حُر ذی جا،ص۲۶۔

۲۷۔ حبیب محمد حبیب، بیتِ سعادت،ص۳۰۔

۲۸۔ ایضاً،ص۳۹۔